ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

اُردو سوانح نگاری میں تصوف کے رجحانات

Trends in Sufism in Urdu Biography

غلام حسن فرید
پی ایچ ڈی اُردو اسکالر، وفاقی اُردو یونی ورسٹی، اسلام آباد، پاکستان
ڈاکٹر زینت افشاں
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو، وفاقی اُردو یونی ورسٹی، اسلام آباد، پاکستان

Ghulam Hassan Fareed
PhD Urdu Scholar, Federal Urdu University, Islamabad
Dr. Zeenat Afshan
Assistant Professor Urdu, Federal Urdu University, Islamabad

ABSTRACT:
Spirituality is an integral part of our life. Spirituality is a separate place from our material world. From the Islamic point of view, Sufism is the path to the satisfaction of spirituality. There is a vast collection of Sufism in Urdu literature. Urdu language and literature evolved with the Islamic teachings and practices of the most revered Sufies. Our forefathers did the work of reforming the Indian society through Sufism. These Sufies casted a great influence on the culture of the sub-continent. The autobiography of our forefathers are the adornment of Urdu literature.

کلیدی الفاظ:
علوم عقلی، شعورِ عقلی، شعورِ مذہبی، علم لدنّی، مابعد الطبیعات، مکاشفہ، مجاہدہ، محاضرہ، مشاہدہ

علوم عقلی کو جانچنے کے لیے شعور کی پختگی کا ہونا ضروری ہے۔ شعور در حقیقت مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر اُن چیزوں کی ماہیت کی کھوج کا راستہ ہے جنہیں عقل کے ادراک سے ماورا سمجھا جاتا ہے۔ شعور کی پختگی کسی علم یا حقیقت کو پرکھنے کی وہ سطح ہے جہاں انسان خود سے سوال کرتا ہے کہ میں کون ہوں؟ میری حقیقت کیا ہے؟ زندگی اور اس کا راز کیا ہے؟ کائنات کیسے تخلیق ہوئی؟ اس کائنات کی تخلیق کے پیچھے کون سی طاقت کار فرما ہے اور اگر ہے تو وہ کہاں ہے؟ کب سے ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ کائنات اور اس کے مظاہر کی کار فرمائی کے بارے میں سوال ہمارے شعور کی پختگی کی علامت ہے۔ انسان خود سے جب ایسے سوال کرتا ہے اور جواب نہیں پاتا تو حیرت اور جستجو میں سرگرداں کائنات کی اس حقیقت کی تلاش میں مختلف راستوں کا راہی بن جاتا ہے۔

ان سوالات کا تعلق ظاہری دنیاوی کیفیات کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی روحانی دنیا سے منسلک ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی شخص روح اور روحانیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ روحانی دنیا ایک الگ جہان ہے۔ وہاں تک رسائی حاصل کرنے یا اس جہاں کی کیفیات کا مشاہدہ کرنے کے لیے دیدۂ بینا اور ذہن رسا کی ضرورت ہوتی ہے جو ریاضت، مجاہدہ، یکسوئی، گیان اور نروان (اسے کوئی نام بھی دیں) کے بغیر ممکن نہیں۔ سائنسی اعتبار سے طبیعات (Physics) کا علم مادہ کی ماہیت اور اس کی حقیقت کے بارے میں ہے جبکہ روحانی دنیا کے متعلق علم حاصل کرنے اور اس کی کیفیات بارے معلومات حاصل کرنے کے لیے سائنسی زبان میں مابعد الطبیعات کا لفظ مستعمل ہے۔ مابعد الطبیعات (Meta Physics) کا علم دو راستوں سے حاصل کیا جاتا ہے جن میں پہلا عقل اور دوسرا عقیدہ ہے۔ عقل فلسفے کا دوسرا نام ہے جب کہ عقیدہ مذہب کا۔ بظاہر فلسفے کا کام کائنات میں فطری وحدت تلاش کرنا ہے جب کہ اشیا کو مذہبی بنیادوں پر پرکھنا عقیدے کا کام ہے۔ یہاں آکر انسانی شعور دو ذیلی حصوں شعورِ عقلی اور شعورِ مذہبی میں بٹ جاتا ہے۔ شعورِ عقلی اشیا کی ظاہری ماہیت کے بارے میں

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

معلومات فراہم کرتا ہوا ان کے تعلق کو آپس میں جوڑتا ہے جب کہ مذہبی شعور اشیا کو وحدت کاملہ سے جوڑتا بھی ہے اور اس بات کی بھی کھوج لگاتا ہے کہ اس وحدت کاملہ کی اپنی الگ پہچان اور شناخت موجود ہے۔ شعورِ عقلی کو شعورِ نظری بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی ماہیت اور پرکھ کے حوالے سے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا کہنا ہے:

> ''شعور نظری کو اس امر پر ذرا بھی اصرار نہیں کہ وحدت کی ماہیت کیا ہو۔ علم منظم کا شعور حاصل ہو سکے تو شعورِ نظری ممکن ہے۔ اس کے لیے سب یکساں ہے۔۔۔ شعورِ مذہبی اس بات پر مصر ہے کہ وحدت کی حقیقت کیا ہے؟''(۱)

اس شعورِ مذہبی کو حاصل کرنے کے لیے اسلامی نقطہ نظر سے جس راستے کا انتخاب کیا جاتا ہے اسے اصطلاح میں تصوف(*Spirituality*) کہا جاتا ہے۔ گویا تصوف اسلام کا باطنی پہلو ہے۔ یہ ایک فکر اور طریقہ زندگی کا نام ہے۔ تھوڑا سا مختلف اور تھوڑا سا مشکل۔ مختلف اس لیے ہے کہ جستجو اور تلاش کا مرکز و محور جدا ہوتا ہے اور مشکل اس لیے کہ یہ نفس کے خلاف جہاد کا نام ہے۔ اس طریق کو اختیار کرنے والے کو صوفی کہا جاتا ہے۔ لفظ صوفی اور تصوف کے بارے میں علمائے تصوف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لفظ صوفی کی اصل تلاش کرنے کے لیے سب سے پہلی کتاب ''صفوۃ التصوف'' کے نام سے حافظ محمد بن طاہر المقدسی (۱۱۱۳۔۱۰۵۶ء) نے لکھی۔ انہوں نے اپنی کتاب میں لفظ صوفی کے بارے میں بیان کیا ہے کہ کوفہ کے ایک محدث ولید بن قاسم (متوفی ۷۰۶ء) سے کسی نے سوال کیا تو انہوں نے وضاحتاً کہا:

> ''قوم فی الجاہلیۃ یقال لہم صوفہ انقطعواالی اللہ عزوجل وقطنعوالکعبۃ فمن تشبتہ بہم فہم الصوفۃ
> جاہلیت میں صوفہ کے نام سے ایک قوم تھی جو اللہ تعالیٰ کے لیے یکسو ہو گئی تھی اور جس نے خانہ کعبہ کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر لیا تھا پس جن لوگوں نے ان سے مشابہت اختیار کی وہ صوفیہ کہلائے۔''(۲)

لفظ صوفی کی تشریح کرتے ہوئے امام ابی بکر محمد بن اسحاق الکلاباذی (متوفی ۹۹۴ء) اپنی کتاب ''التعرف علی مذہب اہل التصوف'' میں لکھتے ہیں:

> ''انہیں صوفی اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ اللہ عزوجل کے حضور میں پہلی صف میں ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ انہیں ان کے باطن کی صفائی اور پاکیزگی کی وجہ سے صوفی کہا گیا یا پھر یہ کہ ان کے اوصاف 'اہل صفّہ'' کے اوصاف سے ملتے ہیں۔''(۳)

صوفی کے بارے میں شیخ ابو نصر عبداللہ بن علی سراج طوسی (متوفی ۹۸۸ء) اپنی کتاب ''اللمع فی التصوف'' کا کہنا ہے:

> ''جس طرح فقیہہ کو ''فقہ'' سے، زاہد کو ''زہد'' سے، متوکل کو ''توکل'' سے اور صابر کو ''صبر'' سے منسوب کیا جاتا ہے اسی طرح صوفیہ کو ایک نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر شے کا علم جانتے ہیں۔ یہ ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہوتے رہتے ہیں اس لیے ان کی ہر حالت کا الگ نام بنتا ہے۔ ان کے لباس کے حوالے سے یہ تفصیل ملتی ہے کہ یہ انبیاؑ کی بھی عادت تھی اور صوفیہ کی علامت رہی ہے اس لیے صوفیہ نے اس لباس کو ترجیح دی۔''(۴)

تصوف کے لغوی اعتبار سے معنی ظاہر و باطن کا تزکیہ، قول و فعل میں اخلاص پیدا کرنا اور دنیاوی عیش و عشرت سے اعراض کرتے ہوئے اللہ کے ساتھ عشق کا تعلق استوار کرنا ہے۔ یہ علم باطن، علم قلب و روح، علم لدُنّی، علم مکاشفہ، علم اسرار اور علم حقیقت بھی کہلاتا ہے۔ تصوف بنیادی طور پر

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

اہلِ حقیقت کی اصطلاح ہے جس کا کام صوفیا کے اخلاق سنوارنا اوران کے اخلاق و اوصاف کو طریقت و سلوک کی راہوں سے متصل کرنا ہے۔ یہ دلوں کا تصفیہ کرنے کا عمل ہے۔ محمد رواس قلعہ جی نے حجۃ الاسلام امام غزالی کے حوالے سے لکھا ہے:

''ھوعلم الصدیقین والمقربین فھوعبارۃعن النوریطھرفی القلب عند تطھرہ وتزکیۃ من الصفات المذمومۃ اوبافعالہٖ وحکمتۃ فی خلق الدنیا والاخرۃ''

''یہ صدیقین اور مقربین کا علم ہے جو نور سے عبارت ہے جو دل میں پاکیزگی لاتا اور قابل مذمت صفات پر تزکیہ کرتا ہے اور اپنے عمل اور حکمت سے دنیاو آخرت میں پاکیزگی کا اظہار کرتا ہے۔''(۵)

تصوف کی اصل دو باتیں ہیں۔ا۔ تزکیہ نفس ۲۔ احسان۔ حضرت داتا علی ہجویریؒ کشف المحجوب میں حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ تصوف کی بنیادی خصوصیات آٹھ ہیں اور یہ آٹھ ہی جلیل القدر انبیا علیہ السلام کی سنت ہیں جن کو ایک صوفی اختیار کرتا ہے۔ سخاوت:(حضرت ابراہیمؑ کی)، رضا:(حضرت اسماعیلؑ کی)، صبر :(حضرت ایوبؑ کی)، اشارہ:(حضرت زکریاؑ کی)، غربت:(حضرت یحییٰؑ کی)، گدڑی:(حضرت موسیٰؑ کی)، سیاحت:(حضرت عیسیٰؑ کی) اور فقر:(حضرت محمد ﷺ کی)۔ ان تمام سنتوں پر عمل پیرا ہونے اور راہ سلوک میں منازل کو طے کر کے اللہ کی قربت کو حاصل کرنے والے کا نام صوفی ہے۔

تصوف کے دو پہلو نمایاں ہیں اول نظری، دوم عملی۔ اول الذکر میں ہر وہ پہلو یا عمل یا برتاؤ شامل ہیں جو بظاہر انسانوں کو نظر آتے ہیں جن میں عقل، انسانیت سے محبت، ریاضت و مجاہدہ اور رجوع الی اللہ شامل ہے۔ موخر الذکر میں صوفی کو جن مراحل سے گزرنا ہوتا ہے ان کا تعلق روحانی اعمال و انکشافات سے ہوتا ہے جس میں توبہ، ورع، زہد، فقر، صبر، توکل اور رضائے الٰہی کا طالب ہونا ہے۔ توبہ سے رضائے الٰہی تک صوفیانہ منہاج کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جو بالترتیب مجاہدہ، محاضرہ اور مشاہدہ کہلاتے ہیں۔

ہمارے گرد و پیش کی واقعاتی اور وجودی دنیا دراصل ایک باطنی ربط سے مربوط ہے۔ صوفی، شاعر اور ادبا اس باطنی ربط اور رشتے کو ظاہر کر کے واقعاتی دنیا کو آشکار کرتے ہیں۔ چوں کہ اس باطنی ربط کی پرکھ اور ماپ کے لیے ہمارے عقلی پیمانے پورے نہیں اترتے اس لیے ان کی پہچان کے لیے ہمیں ماورائے عقل تک جانا ہوتا ہے اور اس کے لیے تصوف ہی ایسا راستہ ہے جس کے ذریعے ہم ان باطنی روابط تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہر تخلیقی عمل وجدان اور تخیل کا مرہون منت ہے اس لیے صوفی بھی ادبا اور شعرا کی طرح اشیا کے باطنی اور روحانی ربط کو تلاش کر کے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں بیان کرتا ہے۔

تخلیقی زندگی محض ادب و شعر نہیں بلکہ وہ زندگی ہے جس میں عقل و حُسن کی کار فرمائی کے ساتھ ساتھ انصاف و محبت کی اقدار کی جھلک دکھائی دے۔ یہی وہ اقدار ہیں جو صوفیانہ منہاج میں تعلیم و تربیت کا حصہ ہیں۔ وسعت قلب و نظر کے بغیر کوئی بھی تخلیقی عمل پروان نہیں چڑھ سکتا۔ تصوف میں خود بینی کی صلاحیت بھی موجود ہے اور اپنے نقطہ نظر کے اظہار کے لیے وسعت لفظی و وسعت نظری بھی موجود ہے۔ ایسی تخلیق جو صوفیا نے اپنے صوفیانہ ادب میں پیش کی ہے وہ قاری کی جمالیاتی حس کو مسرور کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ذہنی افق کو بھی کشادہ کرتی ہے۔

تصوف اخلاقیات کا حامل ہے اور اخلاق جمال کے لیے کسوٹی ہے جب کہ جمال ہی تخلیق کی بنیاد ہے۔ انسانی مثبت اقدار جمال کی ایک شکل ہیں اور ان مثبت اقدار کو فروغ دینا دراصل جمالیات کو فروغ دینا ہے۔ صوفی ادبا اور شاعر اپنی ان جمالیاتی اقدار کو پیار اور محبت کے ذریعے زمانے میں پھیلاتے ہیں اور کائنات میں بکھری ہوئی ان اجمالی اشکال کو ایک مرکز پر لا کر پیش کرتے ہیں۔ پیار اور محبت جمالیات کے بغیر اپنا اثر نہیں رکھتے۔ پیار و محبت اور جمالیاتی اقدار کی ترویج سے آپ کائنات کو مسخر کر سکتے ہیں بل کہ یوں کہیے کہ یہی اقدار خدا کی معرفت کے حصول کے لیے مشعل راہ ہیں تو بے جانہ ہو گا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے ایک مضمون ''جھگڑے دین و دل کے'' میں بیان کرتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

"انسانی زندگی عبارت ہے دین اور دل کے مجموعے سے یا ان کی مناسب ترتیب و ارتباط سے۔۔۔ دین اور دل وہ کہسار ہیں جن کو صرف محبت کے ذریعے سر کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ قلزم ہے جنہیں محبت کی کشتی کے ذریعے ہی عبور کیا جا سکتا ہے اور یہ کشتی ادب ہے جس کا اولین موضوع محبت ہے جس سے خدا کی محبت خارج نہیں۔ اسی خدائی محبت کا دوسرا نام دین ہے۔ ادب کا وسیلہ کیمیائے محبت ہے جو کل زندگی پر محیط ہے۔"(۶)

فن کار تخلیقی عمل میں جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسے صورتوں اور تمثیلوں میں ڈھال کر پیش کرتا ہے جب کہ صوفی ان تمام محسوسات کا مشاہدہ کرتے ہوئے حالت صحو میں آ کر بیان کرتا ہے لہٰذا صوفی اس کائنات کی صورتوں اور تمثیلوں کو عام ادیب کی نسبت زیادہ بہتر اشاروں، کنایوں اور تمثال میں ڈھال کر پیش کرتا ہے اور اسی لیے وہ اس فانی دنیا میں رہتے ہوئے آفاقی ادب کی تخلیق کرتا ہے۔

حضرت شبلیؒ (متوفی ۳۳۴ھ) پہلے صوفی تھے جنہوں نے تصوف کے اسرار و رموز کو عوام الناس کے سامنے برملا پیش کیا ما قبل اہل تصوف ان اسرار و رموز کو ارباب سلوک کو سینہ بہ سینہ ہی منتقل کرتے تھے۔ حضرت شبلیؒ نے مسئلہ وحدت الوجود کو بڑی شد و مد کے ساتھ بر سر منبر بیان کر دیا۔ شیخ فرید الدین عطارؒ نیشاپوری اور شیخ نظامی گنجویؒ نے اپنے کلام میں بھی اس فلسفے کو خواص سے عوام تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے بعد شیخ اکبر حضرت ابن العربیؒ (متوفی ۱۲۴۰ء) نے "فصوص الحکم" میں تصوف کی حقیقت اور اسرار و رموز کو فلسفیانہ انداز میں لکھا۔ ابن العربی کے مقلدین میں مولانا جلال الدین رومیؒ، علامہ جلال الدین سیوطیؒ، سید عبد الکریم الجیلی، امام عبد الوہاب شعرانی اور مولانا جامی بہت معروف شخصیات ہیں۔

ہندوستان کی سرزمین پر شیخ اکبر ابن العربی کے فلسفہ وحدت الوجود کے مقابلے میں شیخ احمد سرہندی حضرت مجدد الف ثانیؒ (متوفی ۱۶۲۴ء) وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے اپنے کشف سے یہ دعویٰ کیا کہ وحدت الوجود حقیقت کے مطابق نہیں ہے اور غلط ہے بلکہ ایک حال ہے جو اثنائے سلوک میں صوفیوں پر وارد ہوتا ہے۔ شیخ احمد سرہندی کی مخالفت اہل ہند کے کئی علما اور صوفیا نے کی یہاں تک کہ نامور عالم دین اور محدث شاہ ولی اللہ نے بھی اپنے مکتوبات مدنی میں تردید کی ہے جس کو میکش اکبر آبادی نے اپنی کتاب مسائل تصوف میں نقل کیا ہے:

"میں کہتا ہوں یہ قول (وحدۃ الوجود) عقل سے اور کشف سے دونوں طرح سے صحیح ہے جس کا کوئی عاقل انکار نہیں کر سکتا اس پر اہل عقل کے تمام گروہوں کا اتفاق ہے۔ صوفی جب یہ کہتے ہیں کہ عالم عین حق ہے تو اس سے وجوداتِ خاصہ کی نفی نہیں ہوتی۔ مجدد صاحب نے جو شیخ اکبر کی مخالفت کی وہ بغیر سوچے سمجھے کی اور یہ علمی لغزش ہے۔"(۷)

اس تردید کے جواب میں کئی ایک رسالے منظر عام پر آئے جن میں مولوی غلام یحییٰ (متوفی ۱۱۸۶ھ) کا رسالہ "کلمۃ الحق" نمایاں ہے۔ پھر اس رسالے (کلمۃ الحق) کی تردید میں شاہ رفیع الدین (۱۸۱۸۔۱۷۵۰ء) نے ایک کتاب "دفع الباطل" لکھی۔ اس کے بعد قاری ثنا اللہ پانی پتی (۱۸۱۰۔۱۷۳۰ء) نے "ارشاد الطالبین" میں تصوف کے دونوں فلسفوں میں مطابقت کی کوشش کی۔ اس ضمن میں خواجہ میر درد نے بھی ایک کتاب "علم الکتاب" کے نام سے لکھی۔ تصوف کے مباحث میں لکھا گیا یہ ادبی خزینہ ہمارے اسلاف اور علمائے تصوف کے شاندار کارناموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس ادبی خزینے میں ہمارے اسلاف اور صوفیوں کی حالتِ زندگی کے ساتھ ان کی روزمرہ کشف و کرامات اور بیانات کو بھی شامل کیا جاتا رہا۔ دوسرے معنوں میں عربی اور فارسی زبان میں علمِ تصوف کی رنگارنگی میں ہمارے اکابرین کا سوانحی ادب بھی تخلیق ہوتا گیا۔

اُردو ادب سے تصوف کو علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو ادب کی آبیاری ہی صوفیا کی مرہون منت ہے۔ اُردو کے اولین شعرا اور مصنفین خود صوفی تھے۔ شمالی ہند سے تعلق رکھنے والے اُردو کے پہلے شاعر حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ (۱۲۶۵۔۱۱۷۳ء)، گجرات سے شیخ بہاؤ الدین باجنؒ (پیدائش ۹۱۲۔۷۹۰ھ)، دہلی سے حضرت نظام الدینؒ اولیا محبوب الٰہی (۱۳۲۵۔۱۲۳۸ء) اور حضرت امیر خسروؒ (۱۳۲۵۔۱۲۵۳) ایک کامل ولی اور

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

صوفی بزرگ تھے۔ اُردو ادب کی پہلی صوفیانہ تجربہ گاہ بہمنی سلطنت تھی۔ اس سلطنت کی تشکیل میں صوفیانہ روایات کا موثر کردار تھا۔ اس دور میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ (۱۳۲۱۔۱۴۲۲ء)، شاہ شمس العشاقؒ، برہان الدین جانمؒ (متوفی ۱۵۸۲ء)، شیخ غلام داولؒ اور شاہ امین الدین اعلیٰؒ جیسی اکابر صوفی ہستیاں موجود تھیں جن کی تعلیمات اور صوفیانہ رنگ نے اُردو کی کھیتی کو زرخیزی سے نوازا۔

ولی دکنی (۱۶۶۷۔۱۷۰۷ء)، میر تقی میر (۱۷۲۳۔۱۸۱۰ء)، خواجہ حیدر علی آتش (۱۷۷۸۔۱۸۴۷ء)، غلام ہمدانی مصحفی (۱۷۴۸۔۱۸۲۴ء) اور سب سے بڑھ کر اُردو ادب میں صوفی شاعر کی حیثیت سے پہچانے جانے والے خواجہ میر درد (۱۷۲۰۔۱۷۸۵ء)، ان کے علاوہ مرزا غالب (۱۷۹۷۔۱۸۶۹ء) اور علامہ اقبال (۱۸۷۷۔۱۹۳۸ء) بھی اچھے شاعر ہونے کے ساتھ باقاعدہ صوفی منش انسان تھے۔

ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے بانی اور موسس اعلیٰ حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتی اجمیری ہیں۔ اگرچہ ان کا کوئی کلام یا ان کے ملفوظات میں سے کوئی حصہ اُردو یا ہندوی زبان میں دستیاب نہیں لیکن یہ بعید نہیں کہ حضرت صاحب عربی اور فارسی کے علاوہ مقامی بولی بھی جانتے تھے اور یہی مقامی بولیاں جو اُردو کی تشکیل میں مشعل راہ ثابت ہوئیں، میں لوگوں کو واعظ و تبلیغ کیا کرتے تھے۔ ان کے بعد ان کے خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ دہلی میں رہتے تھے۔ حضرت معین الدینؒ کی طرح ان کا کلام بھی ہندوی یا ہندی یا ریختہ میں دستیاب نہیں تاہم قرین قیاس یہی ہے کہ اپنے مرشد کی طرح انہوں نے بھی دہلی کی مقامی بولی جس کو کھڑی بولی یا برج بھاشا کہا جاتا تھا، میں دین اسلام کی تبلیغ کی ہو۔ سیر الاولیا میں حضرت خواجہ فرید الدین مسعودؒ گنج شکر اور حضرت بختیار کاکیؒ کے درمیان ہونے والے ایک مکالمے کا ذکر ہے جس میں دونوں اصحاب مقامی بولی میں بات چیت کر رہے ہیں۔

بالتحقیق حضرت خواجہ فرید الدین مسعودؒ گنج شکر جو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے، ہندوستان میں پہلے صوفی بزرگ ہیں جن کا کلام ہندوی یا ریختہ میں دستیاب ہے۔ آپ کے اقوال، چھوٹی چھوٹی باتیں، جملے اور گفت گو میں ہندی الفاظ کی کثرت آپ کے ملفوظات میں مل جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کا منظوم کلام، آپ کے شلوک بھی ہندوی زبان کا ذخیرہ اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہی عربی، فارسی اور ہندوی تینوں زبانوں سے واقف تھے۔ آپ کے مرید اور خلیفہ حضرت امیر خسروؒ اور حضرت امیر حسنؒ سنجری نے ہندوی اور ریختہ زبان میں باقاعدہ شعر کہے ہیں۔ شیخ برہان الدینؒ غریب جو حضرت نظام الدین اولیا کے مرید اور خلیفہ تھے۔ وہ بھی عربی اور فارسی کے ساتھ مقامی بولی ہندوی سے خوب آشنا تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب "شمائل الاتقیا" کا ترجمہ ہندی زبان میں ایک بزرگ میر اں یعقوب سے کروایا تھا۔ شمائل الاتقیا متصوفانہ رنگ لیے ہوئے قدیم ہندوی کی بہترین کتاب ہے اس کے گولکنڈے کے قدیم نثری نسخے کے بارے میں ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

> """شمائل الاتقیا" اگرچہ "سب رس" سے صرف ۳۳ سال بعد لکھی گئی ہے لیکن اس کی زبان بہت صاف اور مقابلتاً جدید معلوم ہوتی ہے۔ میر اں یعقوب کی عبارتیں جدید نثر سے بہت قریب نظر آتی ہیں اور اس سے پتا چلتا ہے کہ زبان کتنی تیزی کے ساتھ نشوونما کی منزلیں طے کر رہی تھی ۔۔۔میر اں یعقوب نے بہت سے قدیم الفاظ ترک کر کے ان کی جگہ جدید الفاظ استعمال کیے ہیں ۔۔شمائل الاتقیا کی زبان قدیم اور جدید نثر کی درمیانی کڑی معلوم ہوتی ہے۔"(۸)

حضرت خواجہ بندہ نوازؒ گیسو دراز بذات خود اور ان کے والد سید محمد یوسف المعروف سید راجا ریختہ گو شاعر تھے۔ اس کے علاوہ ان کے خاندان کے دوسرے بزرگوں کے حالات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زیادہ تر توجہ مقامی زبان میں تبلیغ دین کی طرف تھی۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، سید محمد عبداللہؒ چشتی اور شیخ عین الدینؒ گنج العلم تینوں بزرگ بہمنی دور میں قدیم اُردو کے موجد مانے جاتے ہیں۔ تینوں بزرگوں نے دکنی زبان میں مذہب اور تصوف کے موضوع پر قلم اٹھایا۔ ان کی تاریخ لسانیات میں بھی گراں قدر خدمات ہیں۔ خواجہ بندہ نوازؒ کی تصوف کے موضوع پر تقریباً تیس کتابیں موجود ہیں تاہم ان میں سے کچھ عربی، فارسی اور کچھ دکنی زبان میں دستیاب ہیں۔ مؤلف "روضۃ الاولیا" نے لکھا ہے کہ حضرت بندہ نواز ہر روز نماز ظہر کے بعد

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

تصوف اور حدیث کے موضوع پر مریدین اور حلقہ ادارت میں درس دیا کرتے تھے اور جو لوگ عربی فارسی سے نابلد تھے ان کے لیے مقامی دکنی زبان میں تبلیغ کرتے تھے۔ معراج العاشقین، ہدایت نامہ، عشق نامہ، تلاوت الوجو، شکار نامہ، تمثیل نامہ اور ہشت مسائل تمام رسالے دکنی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ شاہ میراں جیؒ شمس العشاق اپنے زمانے کے اولیا کبار میں شامل ہوتے ہیں جنہوں نے تصوف کو موضوع سخن بنایا۔ انہوں نے دکنی زبان میں کئی ایک رسائے لکھے۔ شرح مرغوب القلوب، جل ترنگ اور گل باس ان کے قابلِ ذکر رسائل ہیں۔ انہوں نے نثر کے علاوہ دکنی اُردو میں منظوم رسائل بھی لکھے جن میں شہادت الحقیقت، خوش نامہ اور خوش نغز شامل ہیں۔ ان کے بعد ان کے فرزند شاہ برہان الدین جانم نے بھی قدیم ہندی نظم میں کئی ایک رسالے عارفانہ موضوعات پر قلم بند کیے۔ ان کے مشہور ہندی رسائل کے نام "بحر القائق" اور "کلمۃ الحقائق" ہیں جس میں انہوں نے تصوفانہ سوال و جواب کا انداز اپنایا ہے۔ یہ مختصر احوال دکنی صوفی بزرگان کے ہیں جنہوں نے قدیم دکنی اور گوجری میں نظم و نثر کے خزانے جمع کیے اور یہی خزانے بعد میں دکنی مقامی زبان کو ہندوی اور پھر ریختہ تک پہنچانے کا سبب بنے۔ دکنی ادب کے ابتدائی عہد میں زبان کا ایک منصب صوفیانہ تصورات کا اظہار تھا اس لیے اس عہد کی ادبی کاوشوں کو "صوفیانہ ادب" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

شیخ بہاالدین باجنؒ فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ بقول محمود شیرانی باجن پہلے شخص ہیں جنہوں نے اُردو زبان کو "دہلوی زبان" سے یاد کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دنوں میں بھی اُردو کو برج بھاشا سے الگ تسلیم کیا جاتا تھا۔ شیخ باجن کی کتاب جس میں انہوں نے ہندی دوہے لکھے ہیں، کا نام "خزانہ رحمت" ہے۔ اس میں موجود اشعار کی زبان اس قدر صاف ہے کہ جدید دور کے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ خوب محمد چشتی کی دو کتابیں "خوب ترنگ" اور "چھند چھنداں" ہیں۔ ان میں سے خوب ترنگ کا زیادہ حصہ فارسی زبان میں ہے جب کہ چھند چھنداں نے قدیم اُردو کو جدید اُردو میں بدلنے کے منظر نامے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ کتاب ایک نئے عہد کے طلوع ہونے کا پیش خیمہ ہے اور اس کتاب کو اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں انقلابی حیثیت حاصل ہے۔

متصوفانہ ادب کے دور اول میں موجود صوفیا نے روحانیت اور اخلاص و اخلاق کی تربیت کی۔ لوگوں کی روحانی بلندی کی طرف متوجہ ہوئے اور ضبطِ نفس اور درویشی کا راستہ اختیار کیا۔ اللہ کی رضا پر راضی رہنا اور کسی کے آگے احتیاج کا ہاتھ نہ پھیلانا ان کا طرہ امتیاز رہا۔ دوسرے دور کے صوفیا کے ہاں تصوف ہمیں فلسفیانہ بنیادوں پر استوار دکھائی دیتا ہے۔ اس دور کے صوفیا نے تصوف کو باقاعدہ ایک علم کے طور پر متعارف کرواتے ہوئے اس کی بنیادیں فلسفے کے ساتھ ملائیں اور خانقاہیں اور مدارس تعمیر ہوئے۔ جن میں باقاعدہ طور پر عشق حقیقی اور علم باطن کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تصوف کے لیے نئی نئی اصطلاحیں وضع ہوئیں۔ اس دور کے صوفیا نے عقل کے اندھیروں میں عشقِ الٰہی کا چراغ روشن کیا اور اسلامی عقائد و فکر کو مستحکم کیا۔ تیسرا اور آخری دور تصوف کی تاریخ میں سلاسل کے آغاز اور خانقاہی نظام کی بنیاد لے کر داخل ہوا۔ اس دور کے معاشرتی حالات کا جائزہ لیا جائے تو انتہائی خطرناک صورت حال ہمارے سامنے آتی ہے۔ بغداد میں منگولوں نے تباہی مچا رکھی تھی۔ جگہ جگہ پر نئے نئے فرقے جنم لے رہے تھے۔ قرامطیہ نے الگ شورش برپا کر رکھی تھی۔ اس دور کے صوفیا نے تصوف کی تعلیم کے ذریعے انسان دوستی اور سلامتی کا درس دیا۔ اخلاقی قدروں کو مثبت کرنے اور معاشرے کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ اسی دور میں تصوف کو تمثیلی خزینہ حاصل ہوا۔ تصوف کے بڑے بڑے سلاسل کی ابتدا ہوئی جو کہ دنیا بھر کے انسانوں کے لیے رشد و ہدایت لے کر مختلف ممالک تک پہنچے۔ ان میں سلسلہ قادریہ، سلسلہ چشتیہ، سلسلہ نقشبندیہ اور سلسلہ سہروردیہ قابل ذکر سلاسل ہیں جنہوں نے پوری دنیا کے انسانوں کو اپنے افکار اور اخلاق سے متاثر کیا۔

ہندوستان کا ہر باشندہ صوفیا کے فیضان کا ممنون ہے۔ ان صوفیا نے مقامی زبانوں کو سیکھ کر مقامی لوگوں میں مقامی بولی میں ہی اسلام کی تبلیغ کی۔ تحقیق کے تانے بانے اگر مثبت انداز میں جوڑے جائیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اُردو زبان کی ابتدا کا سہرا دراصل سلسلہ چشتیہ کے صوفی بزرگوں کی عطا ہے جنہوں نے اس زبان کے لیے ہندوستان کی ہزار سالہ بگڑی ہوئی قوم میں اخلاقی شعور پیدا کرنے کے لیے ان ہی کی مقامی زبان کو استعمال کرتے ہوئے اس بنجر زمین کو نرم کیا اور اس میں محبت و انسیت کا وہ بیج بویا جو رفتہ رفتہ پروان چڑھتا گیا۔ اس کی آبیاری کے لیے سلسلہ چشتیہ کے کئی بزرگ اپنے اپنے حصے کا

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

کام کر کے روانہ ہوئے یہاں تک کہ ولی دکنی نے باقاعدہ طور پر اس تن آور درخت کا پہلا پھل ہندوستانی باشندوں کے لیے پیش کیا۔ دین اسلام کی پیش رفت اور اُردو زبان کی ابتدا کے معاون کے طور پر اِن صوفیا کی مساعی جمیلہ ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گی۔ اُردو زبان اور صوفیانہ شاعری کے باہمی تعلق کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ”اگر یہ کہا جائے کہ اُردو زبان و ادب کا جنم بازاروں میں ہوا اور تربیت خانقاہوں میں ہوئی تو غلط نہ ہو گا۔ ہمارا کلاسیکی ادب فکر اور اسلوب دونوں اعتبار سے تصوف سے متاثر رہا ہے۔ تصوف کی فلسفیانہ بنیادوں کو سمجھے بغیر اُردو شاعری کی اصطلاحوں کو نہیں سمجھا جا سکتا۔“(۹)

ولی دکنی کو اُردو کا باقاعدہ پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ولی نے تعلیم کی غرض سے دلی اور اورنگ آباد کا سفر کیا جہاں اس نے وقت کے معروف صوفیا، مشائخ اور شعرا کی صحبت اختیار کی اور ان سے فیض لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کو تصوف اور صوفیا کرام سے قلبی لگاؤ تھا اور اس نے نا صرف اس مسلک پر عمل کیا بلکہ اپنی شاعری کے ذریعے تصوف کی عقدہ کشائی بھی کی۔ ولی نے فارسی کے تتبع میں تصوف کے مضامین جن میں دنیا کی بے ثباتی، توکل و قناعت، انسان کی روحانی عظمت، اخلاقی تربیت اور فنا اور بقا کے مسئلے کو اُردو شاعری میں خوبصورت اور نئے انداز میں برتا۔

مرزا مظہر جانِ جاناں سلسلہ چشتیہ کے نامور صاحب حال صوفی اور اُردو کے بے پایاں شاعر تھے۔ مرزا خود صوفی تھے اس لیے انہوں نے اپنے کلام میں تصوف کی داخلی اور تجرباتی تصویر کو قلم بند کیا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں صوفیانہ مضامین محض رسمی یا روایتی انداز میں نہیں باندھے بلکہ حقیقت حال کو اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔ ان کے نمونہ کلام میں زبان سادہ اور منجھی ہوئی ہے۔ وہ وحدت الشہود، دنیا کی بے ثباتی اور فنا و بقا جیسے موضوعات کو اپنے کلام میں جگہ دیتے ہیں۔

سراج الدین اورنگ آبادی بھی اُردو کے ممتاز صوفی بزرگ اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ انہوں نے بھی اپنے کلام میں تصوف کی آمیزش کو ملا کر اُردو شاعری کو ایک نیا روپ دیا۔ یہاں تک اُردو کے ممتاز شعرا کا تعلق صوفیا کی جماعت سے تھا مگر ان کے بعد آنے والے خواجہ میر درد باقاعدہ طور پر اُردو کے ایسے شاعر ہیں جن کی پہچان ان کی صوفی شاعری کی بنا پر ہے اور وہ اُردو کے پہلے صوفی شاعر کہلاتے ہیں۔ خواجہ میر درد نجیب الطرفین سید تھے۔ انہیں علوم عقلی و نقلی کے ساتھ علم تصوف اور فن موسیقی پر بھی کامل دسترس حاصل تھی۔ ان کی تمام عمر زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت اور پند و نصاح میں گزری۔ وہ باقاعدہ سجادہ نشین صوفی تھے۔ تصنیف و تالیف کا بچپن سے شوق تھا۔ ان کی بارہ تصانیف میں سے دس کتابیں فارسی نثر میں ہیں اس کے علاوہ ایک فارسی دیوان بھی ہے جب کہ اُردو زبان میں بھی ان کا ایک دیوان موجود ہے۔ درد شمالی ہند میں پہلے شاعر ہیں جنہوں نے باقاعدہ طور پر تصوف کو اُردو شاعری کے قالب میں ڈھالا۔ اس بارے میں محمد خالد لکھتے ہیں:

> ”درد کو شمالی ہند کی صوفیانہ شاعری میں ان معنوں میں اولیت کا درجہ حاصل ہے کہ ان سے پہلے شمالی ہند کے کسی دوسرے شاعر نے اس شدومد کے ساتھ صوفیانہ خیالات اور مضامین کو اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا تھا۔ خود درد کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ فرماتے تھے:
>
> پھولے گا اس زمین میں گلزار معرفت
> یاں میں زمین شعر میں یہ تخم بو گیا“(۱۰)

دردؔ کے عہد زریں میں خدائے سخن میر تقی میرؔ نے بھی اپنے کلام میں تصوف کی آمیزش کی۔ شاہ نیاز احمد بریلوی، میر سید علی غمگین دہلوی، شاہ تراب علی قلندر اور خواجہ حیدر علی آتشؔ نے بھی اپنے کلام میں علوم صوفیہ اور حقائق تصوف کو متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مابعد مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے کلام میں انسانی زندگی تمام تر پیچیدگیوں سے سانس لیتی دکھائی دیتی ہے۔ زندگی کے تمام جملہ مظاہر اور مسائل مثلاً عشق و محبت، رنج و الم، بے خودی و ہوش مندی، رندی و بادہ خواری، کیف و مستی، رنگینی و رعنائی، زندگی کی بے ثباتی، موت اور بعد الموت کے مناظر اور ان سب سے بڑھ کر تصوف کے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

مسائل پر غالبؔ کی نظر بہت گہری تھی۔ غالبؔ تصوف میں نظریہ وحدت الوجود کے قائل تھے اگرچہ انہوں نے اس حوالے سے اپنے کلام میں رسمی انداز اختیار کیا تھا تاہم وہ عملی تصوف کے قائل تھے۔ میرؔ و غالبؔ کے بعد اُردو شاعری میں صوفیانہ رنگ کی لاج صحیح معنوں میں اگر کسی شاعر نے رکھی ہے تو وہ علامہ اقبال ہیں۔ ورثے میں ملا ہوا تصوف اور بذات خود درعرفان حق کی تلاش میں اقبال ساری عمر سرگرداں رہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُردو ادب کے جدید عہد میں اقبال نے تصوف کا لبادہ اوڑھ کر اسلامی صوفیانہ فکر و افکار کو جِلا بخشی ہے تو بے جا نہیں۔ انہوں نے اسلامی فلسفہ تصوف کی اصل بنیاد کو اپنے کلام کا موضوع بنایا۔ عجمی تصوف اور نام نہاد صوفیوں اور مجاوروں کے خلاف اقبال نے عَلم جہاد بلند کیا اور اپنی تیغ بے نیام سے ایسی کاری ضربیں لگائیں کہ ہندوستانی نوجوان تصوف کے رندانہ ماحول کو ترک کر کے جہانِ دیگری تک جا پہنچے۔ اقبال نے روایتی تصوف کی مخالفت کی اور نوجوانوں کو ایسے صوفی افکار جن میں صرف دکھاوا، مراسم اور مجاوروں جیسی سکنات ہوں، سے باز رہنے کی تلقین کی۔

المختصر اُردو ادب میں تصوف کی باقاعدہ روایت ہمیں شاعری خصوصاً غزل کے میدان میں ہی دکھائی دیتی ہے چوں کہ جس زمانے میں تصوف کی تحریکیں عروج پر تھی، اظہار خیال کا بہترین اور مؤثر ذریعہ شاعری کو ہی سمجھا جاتا تھا۔ مزید برآں شاعری میں اتنی وسعت اور گہرائی موجود ہے کہ وہ اپنے اندر ہر طرح کے خیال اور اظہار کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اُردو کے عظیم شعرا کا تعلق بھی صوفی سلاسل سے تھا۔ اس لیے انہوں نے معاشرے کی فلاح و بہتری کے لیے مقامی اندازِ سخن اپناتے ہوئے شاعری اور خصوصاً غزل کے میدان کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اُردو ادب میں تصوف کا زیادہ ذخیرہ صوفیا کی شاعری کی صورت میں موجود ہے تاہم ہمارے اسلاف نے صرف شاعری کو ہی باعث ابلاغ نہ سمجھا بلکہ مقامی افراد کے لیے ان ہی کی زبان میں بے شمار چھوٹے بڑے نثری رسائل اور اپنے مکتوبات و ملفوظات کے ذریعے تصوف کے اسرار و رموز کو اپنے سامعین کی سماعتوں سے بہرہ مند کیا۔ ہمارے صوفیا نے اپنے سلاسل کی حالاتِ زندگی، ان کے روزمرہ واعظ و نصائح کو ادب کا حصہ بنایا۔ اس ساری بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر بآسانی پہنچ جاتے ہیں کہ ہمارے اُردو ادب سے تصوف کی رنگا رنگی اور چاشنی کو نکال دیا جائے تو اس کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، ''حضرت امام ربانی کا نظریہ توحید''، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۷۴ء، ص ۵۲، ۵۱

۲۔ محمد بن طاہر المقدسی، ''صفوۃ التصوف''، تعلیق احمد شرباصی، مصر، دارالتصنیف، ۱۳۸۰ھ، ص ۸

۳۔ ابو بکر محمد بن ابراہیم الکلاباذی، ڈاکٹر پیر محمد حسن (مترجم)، ''شرح التعرّف لمذھب اہل التصوف''، لاہور، اسلامک بک فاؤنڈیشن، س ن، ص ۳۷

۴۔ ابو نصر سراج طوسی، شاہ محمد چشتی (مترجم)، ''اللمع فی التصوف''، لاہور، ادارہ پیغام القرآن، س ن، ص ۸۷

۵۔ محمد رواس قلعہ جی، حامد صادق قنیبی (مرتبین)، ''معجم الغۃ الفقھاء'' (عربی)، کراچی، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، س ن، ص ۱۳۳

۶۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ''ادب و فن''، طبع اول، لاہور مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۶۸، ۱۶۵

۷۔ میکش اکبر آبادی، ''مسائل تصوف''، نئی دہلی، انجمن ترقی اُردو (ہند)، (۲۰۰۰ء)، ص ۵۷۔۵۸

۸۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر، ''دکنی نثر کا انتخاب''، نئی دہلی، ترقی اُردو بیورو، ۱۹۸۳ء، ص ۱۰۳

۹۔ ڈاکٹر محمد حسن، ''دہلی میں اُردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر''، دہلی، ادارہ تصنیف، ۱۹۸۲ء، ص ۲۸

۱۰۔ محمد خالد، ''اردو شاعری میں تصوف کی روایت اور آسی غازی پوری''، علی گڑھ، شعبہ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۰۹ء، ص ۹